علامہ اقبال اور مذہبی وقوف کی علمی صُورت

مذہبی علم کی علمی صُورت کی احتیاج

علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں جو" اسلامی الہیات کی تشکیل جدید" پر مشتمل ہیں، فرد اور جماعت، اخلاق اور معیشت، مذہب اور سیاست، روحانیت اور سائنس کے درمیان ہم آہنگی نمایاں کرنے کے لیے مذہبی علم کی علمی صورت گری کی ضرورت محسوس فرمائی تھی اور اس کی بنیاد علم اور مذہب کی تطبیق پر رکھی تھی۔ جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے فلسفیانہ فکر کی روایت بھی تطبیق ہی کی رہی تھی!۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ مذہب فلسفہ اور شعر عالیہ ایک ہی مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں اور یہ ان تینوں میں علم ہی کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا اس مسئلے کے مذہبی، فلسفیانہ اور شاعرانہ جوابات کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ یہ ضرورت اس لیے پیش آئی کہ تاریخی انقلاب کے نتیجہ میں جو تبدیلی موثرات زندگی (علم، اخلاق، مذہب، معاشرت، معیشت، سیاست اور بین الاقوامی زندگی) میں رونما ہوئی تھی اس کے نتیجے میں علم (سائنس اور مذہب کے تقاضے، انفرادی زندگی کے اخلاقی تقاضے اور اجتماعی زندگی کے معاشی اور سیاسی تقاضے، دور غلامی میں امن و عافیت اور آزادی حاصل کرنے کے تقاضے ایک دوسرے سے متصادم نظر آنے لگتے تھے۔ ان کے درمیان ہم آہنگی اور سازگاری تطبیق ہی سے پیدا ہو سکتی تھی۔ ہمارے ہاتھ سے علمی امانت چھن گئی تھی اور انسانی استعداد کے زائدہ علم و فکر کی نشو و نما اقدام و خطا کے انداز میں ہوتی رہتی ہے اس لیے بے اندازہ تغیرات رونما ہو گئے تھے جنھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں تضاد پیدا کر دیا تھا اور ان حالات میں انسانی شخصیت کی نشو و نما اور اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لیے فکری سطح پر ہم آہنگی ضروری ہو گئی تھی اور ہم خود اپنی دور مابعد رسالت کی تاریخ کے ہر مرحلے پر صرف تطبیق ہی کرتے چلے آئے تھے جبکہ تطبیق صرف ہمارے ہی فلسفیانہ فکر کی روایت نہ تھی بلکہ فلسفیانہ فکر کے ہر دور کی روایت تطبیق ہی رہی تھی اس لیے افکار میں تطبیق ضروری ہو گئی تھی یہی ان خطبات کا مقصد تھا۔

۱۔ خطبات اقبال (انگریزی) دیباچہ

تطبیق کا جواز

تطبیق ہی کے لیے سقراط نے عقلیت اور سوفسطائیت میں تطبیق کر کے یہ موقف اختیار کیا کہ مابعد الطبیعیات سے دستبردار ہو کر اخلاقیات کی جستجو کی جائے۔ افلاطون نے ماقبل سقراط عقلیت کا موقف اختیار کیا تھا۔ ارسطو نے سقراط کی تنقید اور افلاطون کی عقلیت کے درمیان تطبیق ہی کی سعی کے نتیجے میں عقلیت کو صحیح سمجھا تھا۔ فلاطینوس (Plotinus) نے افلاطون کی عقلیت اور مسیحیت کی تثلیث کے درمیان تطبیق کے نتیجے میں "ہمہ اوست" کا موقف اختیار کیا تھا۔ فارابی نے "الجمع بین الرأیین" میں افلاطون اور ارسطو کے درمیان تطبیق کی کوشش کی تھی۔

مسلمانوں کی پوری فکری تاریخ علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ میں تطبیق ہی کی تاریخ ہے بلکہ اس میں اس حد تک غلو کیا گیا تھا کہ علم بالوحی، کو انسانی استعداد کے زائیدہ سے علم ہی ساز گار بنانے کی کوشش کی جاتی رہی تھی اور علوم القرآن کے نام سے ہر تصنیف میں انسانی استعداد ہی کے زائیدہ علوم کو قرآن سے اخذ کیا جاتا رہا اور جو نشاندہی یعلمکم مالم تکونوا تعلمون (کہ رسول اللہ تمہیں وہ سکھاتے ہیں جو تم نہیں جان سکتے) میں کی گئی ہے گویا وہ رہنمائی قرآن میں تھی ہی نہیں۔ قرآنی علم کو مابعد الطبیعیاتی علم سمجھ کر شعور علمی کے مقولات (Categories) وجود و عدم، ذات و صفات، علت و معلول محدود و لا محدود، قدیم و حادث، واجب و ممکن ہی کے حوالے سے شعور مذہبی میں مضمر حقائق کو سمجھنے کی بدولت شعور علمی کے توحید (Unification) کا تقاضا تو پورا کیا جاتا رہا مگر شعور علمی سے ویسا ہی شدید مطالبہ یعنی امتیازات کو ملحوظ رکھنے کا تقاضا نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اس کے نتیجے میں غایات اور ان کے حاصل کرنے کے لیے لائحہ عمل سے توجہ ہٹتی چلی گئی اور ہم بے مقصدی میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔

اگر آج ہم مذہبی علم کی علمی صورت گری کا مطالبہ پورا کرنا چاہیں تو پہلے ہمیں سائنسی علم کی علمی صورت گری کی شرائط متعین کرنا ہوں گی۔ پھر ہم مذہبی علم کی علمی صورت گری کر سکیں گے۔

مذہبی علم کی علمی صورت کی شرائط

سائنسی علم کے علمی معیار پر پورا اترنے کی شرائط یہ ہیں کہ

۱۔ ہر سائنس کا ایک موضوع ہو جو دوسری سائنسوں کے موضوعات سے مختلف ہو جیسے طبیعیات کا موضوع طبیعی مظاہر حیاتیات کا موضوع نامی مظاہر، نفسیات کا موضوع شعوری مظاہر۔

۲۔ ہر سائنس کا ایک مسئلہ ہو جو وہ اپنے موضوع کو سمجھنے کے لیے بصورت سوال پیدا کرتی اور اسے حل کرتی ہے۔ جیسے عالم غیر نامی (Inorganic) میں حرکت کیوں کر واقع ہوتی ہے؟ مظاہر نامی میں تغیرات کیسے

رونما ہوتے ہیں اور شعوری مظاہر میں مختلف کیفیات شعور کیسے پیدا ہوتی ہیں؟

۳۔ ہر سائنس کے مسئلے کا حل کسی منہاج (Method) کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جیسے طبیعیات کا مشاہدے اور تجربے سے اور نفسیات کا مسئلہ مشاہدہ باطن سے حل کیا جاتا ہے۔

۴۔ چونکہ کوئی سائنس اپنی جستجو کو منتہائے فکر انسانی تک نہیں لے جا سکتی اس لیے ہر سائنس بعض اصولوں کو بے چون وچرا تسلیم کر کے آگے بڑھتی ہے۔ طبیعیات کی رو سے طبیعی مظاہر کا حقیقت ہونا مسلّم ہے حیاتیات کی رو سے مظاہر حیات حقیقت ہیں اور نفسیات کی رو سے شعوری کیفیات کے واقعہ ہونے کو تسلیم کر کے چلنا ضروری ہے۔

۵۔ ہر سائنس کا سہ گونہ وظیفہ ہوتا ہے (الف) مشاہدے سے مدلولات کا جمع کرنا (ب) ان کی گروہ بندی (Classification) اور (ج) توجیہ و تعلیل جس کے لیے ہر سائنس کے اپنے اپنے مقولات (Categories) یا بنیادی تصورات ہوتے ہیں جن کے تحت سوالات کو منظم کیا جاتا ہے جیسے طبیعیات کے مقولات میں مادہ بحیثیت جوہر، خاصیت، کمیت، علت، معلول، حرکت، قوت، زمان، مکان، عدد اور وحدت شامل ہیں اور حیاتیات کے مدلولات جیسے انجذاب، نمو، جزو سے کل کی اور کل سے جزو کی پیدائش، انفرادیت، از خود حرکت (Spontaniety) وغیرہ اور نفسیات کے مقولات جیسے شعور جذبہ، ارادہ، ادراک، از خود حرکت مقصدیت (Purposiveness) وغیرہ۔

۶۔ ہر سائنس کا کوئی مفروضہ ہونا چاہیے جس سے وہ اپنے مدلولات کی توجیہ کرے۔ طبیعیات کا مفروضہ میکانکی علیت (Mechanical Causation) کا مفروضہ ہے کہ ہر غیر نامی وجود اپنی جگہ پر ساکن رہتا ہے اور تب ہی حرکت میں آتا ہے جب اسے کوئی بیرونی مؤثر ایک نقطۂ مکانی سے دوسرے نقطہ مکانی تک اور ایک لمحہ زمانی سے دوسرے لمحہ زمانی تک منتقل کر دے۔ مگر یہ مفروضہ صرف غیر نامی دائرے میں واقع ہونے والی حرکت کی توجیہہ کر سکتا ہے اس کے باہر نہیں اور عالم نامی میں جو تغیرات واقع ہوتے ہیں ان کی توجیہہ صرف مفروضۂ ارتقا (Hypothesis of Evolution) سے کی جا سکتی ہے اور یہ مفروضہ غیر نامی یا شعوری مظاہر کی توجیہہ کے لیے اختیار نہیں کیا جا سکتا اور شعور کی دنیا میں تمام مظاہر کی توجیہہ غائی علیت کی (Purposive Causality) کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے۔

فکر اقبال میں ارتقائی پہلو

یہ سب شرائط پورے ہونے سے طبیعیات حیاتیات اور نفسیات کو علمی نظاموں کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ مذہبی علم کی سائنسی معیار پر تشکیل کے لیے اگر اس انداز کی شرائط پوری نہ ہوں تو یہ تقاضا پورا نہیں ہو سکتا اور علامہ اقبال کی نسبت یہ رائے صحیح نہیں ہو سکتی کہ وہ تادم آخر حسیت (Empiricism) اور اسلام کے درمیان

(Reconciliation) ہی کو مذہبی علم کی علمی صورت سمجھتے رہے ہوں خصوصاً اس صورت میں جب ان کے شعور پہ ایک روحانی واردات کی صورت میں یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی تھی جسے وہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

شبے پیش خدا بگریستم زار مسلمانان چرا خوارند و زارند

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم دلے دارند و محبوبے ندارند

جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا زوال "بے مقصدی" کی وجہ سے ہے اور جب انہوں نے ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کے سامنے ایک ایسا سیاسی نصب العین بھی پیش کیا جو ان حالات میں حیات بخشی کا موجب ہو سکتا تھا تو کیسے ممکن ہے کہ اپنے ہی فرمانے کے مطابق حصول نصب العین کی خاطر عمل پر زور دینے والی کتاب کی طرف متوجہ نہ ہوئے ہوں!!! اور انہوں نے اپنے صدارتی خطبہ کے آخر میں یہ بھی فرمایا کہ

"..... اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے حیات بخش تصور سے ولولہ اخذ کریں تو آپ کی بکھری ہوئی قوتیں از سر نو جمع ہو کر آپ کو مکمل تباہی سے بچا لیں گی۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت یہ ہے کہ "پوری انسانیت کی پیدائش اور دوبارہ زندگی ایسی ہے جیسی ایک فرد کی" تو پھر یہ کیوں ممکن نہیں کہ ہم اپنی زندگی ایک یقین واحد کی طرح بسر کریں جبکہ ہم بجا طور پر یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ یہ ہم ہی تھے جو سب سے پہلے اس اعلیٰ و ارفع تصور انسانیت کو عملاً پیش کر سکے تھے"

اس مقصد کی نشاندہی کے بعد جو مسلمانوں کو از سر نو زندگی عطا کر سکتا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ علامہ اقبال اس سیاسی نصب العین کو پیش کرنے کے بعد اپنے ہی اس موقف کی طرف متوجہ نہ ہوئے ہوں جو انہوں نے قرآن مجید کی نسبت اپنے خطبات کے دیباچے کے اس اولین جملے میں پیش کیا تھا کہ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جسے فکر سے زیادہ عمل پر اصرار ہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک نصب العین اور اس کے حاصل کرنے کے لائحہ عمل کے مطابق جدوجہد جو حسیت اور اسلام کے درمیان تطبیق سے نہ تو متصور ہو سکتا ہے نہ حاصل کیا جا سکتا ہے اس کی خاطر یہ سوال پیدا نہ ہو کہ قرآن کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو ہر دور میں تاریخ کے نوع بنوع تقاضوں کو سنبھالتے ہوئے روشنی (غایت کا تصور) رہنمائی (حصول غایت کا لائحہ عمل) اور حتمی قطعی اور یقینی کامیابی کی اساس مہیا کر سکے؟

کسی قوم کے اٹھنے، بیدار ہونے، جدوجہد کرنے کامیاب ہونے سے پہلے کے تقاضے یہ ہیں کہ

کوئی قوم کیسے بنے؟ کیسے اٹھائی جائے اور کامیابی کی ضمانت کیا ہے؟

اور کامیابی کے بعد کے تقاضے یہ ہیں کہ

زوال سے محفوظ کیسے رہے گی؟ اسباب زوال کیا ہیں؟ اور ان کا ازالہ کیسے ہوگا؟

اور زوال پذیر ہو جانے کے بعد کے تقاضے یہ ہیں کہ

زوال کیا ہے؟ از سرِ نو قوم کیسے بنے؟ کیسے اٹھائی جائے اور کامیابی کی ضمانت کیا ہے؟

اگر ہم نے ان مسائل کی طرف توجہ نہیں کی تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ علامہ اقبال مذہبی علم کی علمی صورت گری فلسفہ سائنس اور مذہب کے درمیان معذرت کو شانہ بہ شانہ ہم آہنگی ہی میں تلاش کرتے رہے ہیں چاہے یہ مسلمانوں کے فلسفیانہ فکر کی روایت ہی کیوں نہ رہی ہو۔

قرآن مجید کو فکر سے زیادہ عمل پر اصرار ہو تو مذہبی علم کی علمی صورت گری کی ایک شرط تو یہ ہو گی کہ علم اور عمل کے درمیان امتیازات کو سمجھا جائے کہ علم کا موضوع حقیقت ہے جسے سمجھنا درکار ہے اور عمل کا موضوع مقصود ہے جسے پانا درکار ہے۔ علم کا مسئلہ یہ ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ اور عمل کا مسئلہ یہ ہے کہ مقصود حاصل کیسے ہو؟ علم کی ابتداء شک سے ہوتی ہے جبکہ عمل کی ابتداء یقین سے۔ علم میں فکر کو اہمیت حاصل ہے اور عمل میں ارادہ اہم ہے۔ علم کا بنیادی تصور جبر ہے اور عمل کا بنیادی تصور اختیار ہے۔ علم کا وظیفہ توجیہہ و تعلیل ہے عمل کا وظیفہ تخلیق و تجدید ہے۔ علم کے تضمنات یہ ہیں کہ ایک طرف ناظر ہو۔ دوسری طرف منظور ہو ناظر میں علم کی استعداد ہو اور منظور ایسا ہو جو ناظر کی استعداد ادراک میں آ سکے اور عمل کے مضمرات یہ ہیں کہ ایک طرف فعال عامل ہو۔ دوسری طرف مقصود ہو حصول مقصد کی راہ میں رکاوٹ ہو یعنی مزاحمت اور فعال عامل کی جانب سے مزاحمت کی مزاحمت ہو علم کا جائزہ صحیح اور غلط کہہ کر لیا جاتا ہے اور عمل کا جائزہ حق و باطل کہہ کر لیا جاتا ہے۔

• قرآنی ہدایت روشنی (غایت کا تعین) رہنمائی (لائحہ عمل) اور ایصال الی المطلوب سے عبارت ہو اور قرآن کافروں پر لاھدی ولاکتب منیر کہہ کر یہ طنز کرتا ہے کہ ان کے پاس نہ واضح نصب العین ہے نہ اُس کے حصول کا ضامن لائحہ عمل۔ تو پھر قرآن مجید ہی سے یہ مطالبہ پورا ہونا چاہیئے کہ جس فطرت انسانی کی نسبت اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

"فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا" اُس کی نشوونما کیسے ہو گی۔ فطرت انسانی کا یہ پہلو انسان کی بالقوۃ فطرت ہے جو فجور و تقویٰ کے امتیاز، ربوبیت کے اقرار، اپنے نفس کی بصیرت اور امانت کی ذمہ داری کے احساس پر مشتمل ہے۔ یہ ایک قلبی استعداد ہے جو نشوونما نہ پا سکے تو اس کا عدم اور وجود برابر ہو جاتا ہے۔ انبیاء کی بعثت اسی لیے ہوتی رہی تھی کہ اسے نشوونما دے کر ایسی زندہ طاقت بنا دیا جائے جو جبلی داعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں پر مشتمل بالفعل فطرت انسانی کو منضبط کر کے منقاد بنائے رکھے بالفعل فطرت کا بالقوہ فطرت کی نشوونما میں مزاحم ہونا ہی اس کی نشوونما کی ایک سازگار شرط ہے۔

علم بالوحی سے فطرت انسانی کے تقاضوں کی تکمیل کی دوسری شرط یہ ہے کہ علم بالوحی سے جن مسائل کا حل مطلوب ہے۔ انہیں انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے مسائل سے متمیز کر کے علم بالوحی اور انسانی علم کے درمیان امتیازات

کو پیش نظر رکھا جائے چونکہ علم بالوحی اور انسانی استعداد کے زائیدہ علم (جن میں بیشتر دینی علوم بھی داخل ہیں) کے درمیان امتیاز پیش نظر نہیں رہا اس لیے علم بالوحی کی جگہ انسانی استعداد کے زائیدہ علوم نے لے لی اور وہ عملاً علم بالوحی کا بدل بن گئے۔

علم بالوحی انسان کو اس نقص کی تلافی کے لیے عطا کیا گیا تھا جو انسانی علم کی نشوونما کی تکمیل پذیر نہ ہونے کی صورت میں اس کی کامیابی میں حائل تھا۔ انسانی استعداد کا زائیدہ علم اس استعداد کے نشوونما پانے کا نتیجہ ہے جو انسان میں ودیعت کر دی گئی تھی جس کی نشاندہی اس آیت میں کی گئی ہے۔

علم آدم الاسماء کلھا

علم بالوحی اور انسانی علم میں امتیاز۔

۱۔ علم بالوحی امکان خطا سے اور عدم تکمیل کے نقص سے بالاتر ہے بخلاف اس کے انسانی استعداد کے زائیدہ علم کی نشوونما اقدام وخطا (Trial and Error) کے انداز میں ہو رہی ہے۔

۲۔ علم بالوحی ہمیشہ سے کامل ہے اس لیے تغیر ناپذیر ہے بخلاف اس کے انسانی علم معرض ارتقاء میں ہے جس کی نشوونما ابھی تک انجام کو نہیں پہنچی۔

۳۔ علم بالوحی کا موضوع نصب العین اور حاصل کرنے کا لائحہ عمل ہے بخلاف اس کے انسانی علم کا موضوع محسوسات ہیں۔

۴۔ علم بالوحی کا مسئلہ اخلاق کے بارے میں یہ ہے کہ زندگی اخلاقی فضائل کے نمونہ کمال کے مطابق ڈھلے تو کیونکر؟ بخلاف اس کے انسانی علم (اخلاقیات) کا مسئلہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کیا ہیں؟ ان کا معیار کیا ہے اور ان کی مابعد الطبیعیاتی اساس کیا ہے؟

۵۔ علم بالوحی کا مسئلہ معاشرے کے بارے میں یہ ہے کہ نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی اخلاقی جدوجہد کرنے والے روحانی الذہن افراد پر مشتمل ایسا معاشرہ وجود میں کیسے لایا جا سکتا ہے جس کی جدوجہد کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف وغم سے محفوظ رہیں۔ انسانی علم عمرانیات کا مسئلہ یہ ہے کہ معاشرہ کیا ہے اور کیوں وجود میں آتا ہے اور کیسے زوال پذیر ہوتا ہے؟

۶۔ علم بالوحی کا معاشی مسئلہ یہ ہے کہ عادلانہ معیشت پیدا کرنے کے لیے معاشی تخلیق کی جدوجہد میں تعطل (Deadlock) کو کیسے رفع کیا جائے اور انسانی علم (معاشیات) کا مسئلہ یہ ہے کہ تخلیق دولت کا نظام کیا ہے؟ اسے معاشی عدل سے کوئی غرض نہیں اور تخلیق دولت کا نظام طریق پیداوار سے متعین ہوتا ہے جو گلہ بانی، تجارت زراعت جاگیرداری رہا ہے اور صنعت بھی اور مشینی صنعت نے اسے بہت ہی غیر متوازن کر دیا ہے۔

۷۔ علم بالوحی کا سیاسی مسئلہ یہ ہے کہ فلاحی ریاست وجود میں کیسے لائی جا سکتی ہے اور انسانی استعداد کے زائیدہ

سیاسی فکر کا مسئلہ یہ ہے کہ ریاست کیا ہے؟ اس کا وظیفہ کیا ہے اور اس کا آئین کیا ہے؟

۸ ۔ علم بالوحی کی رو سے تاریخ کا مسئلہ یہ ہے کہ تخلیق امم اور تجدید ملل کیسے ممکن ہے اور انسانی استعداد کے علم تاریخ کا مسئلہ یہ ہے کہ قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں؟

ان امتیازات کے پیش نظر جب سائنسی علم میں یہ خصوصیت نمایاں ہو کہ اس کے ذریعہ علم میں یکسانی نتائج کے بارے میں یقین ہو سکے کہ (Scientific Knowledge) کی بنیاد پر اس بصیرت کے حاصل ہونے کی بناء پر کہ کس قانون فطرت سے کیا نتائج پیدا ہوں گے بے خطا پیش بینی ممکن ہو تو علم بالوحی سے جو نتائج پیدا کرنے مطلوب ہوں ان کے پیدا ہونے کے لیے علم بالوحی سے ہی یہ بھی معلوم ہو گا کہ انسان کی وہ حالت کیا ہے؟ جسے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بدلنا درکار ہے اور یہ تبدیلی کیسے لائی جا سکے گی؟ اس سلسلے میں علم بالوحی سے ہی یہ بھی طے پانا چاہیئے کہ سائنس کے دائرے میں قوانین فطرت کی بنیاد پر پیش بینی کے انداز میں مذہبی علم کی علمی صورت گری کے بعد یہ یقین ہونا چاہیئے کہ کس عقیدے سے کیا عمل اور کس عمل سے کیا نتیجہ پیدا ہو گا اس کی بے خطا پیش بینی کی جا سکے اور زندگی کے زوال کو عروج میں بدلنے کی حتمی قطعی اور یقینی تدبیر میسر آ سکے۔

مذہبی علم کی علمی صورت کی اساس کا مسئلہ

دراصل مذہبی علم کی علمی صورت گری اس سوال کے جواب پر منحصر ہے کہ کیا انبیاء کی تاریخ نے نوع انسانی کو بالعموم اور اُمت مسلمہ کو بالخصوص کوئی ایسی وراثت سپرد کی ہے جس میں ختم نبوت کے بعد دور ما بعد رسالتؐ میں اُمت مسلمہ کے زوال پذیر ہو جانے کے بعد دوبارہ عروج حاصل کر سکنے کی ضمانت ہو؟

یہ وراثت دو ورثوں پر مشتمل ہے جن میں ایک آفاقی ہے اور دوسرا انفسی۔ آفاقی ورثہ قرآن مجید ہے اور انفسی ورثہ کی طرف اس آیت پاک میں اشارہ ہے۔

وفی انفسکم افلا تبصرون

قرآن مجید پیغمبرانہ دور کے علمی اور عملی کارناموں کی تاریخ ہے اور پہلے ادوار کی تمام کوششوں کے مقابلے میں ہر طرح سے زیادہ جامع اور باکمال بھی ہے اور آخری پیغمبر کے کارنامے تاریخی حیثیت سے بھی نہایت تفصیل کے ساتھ ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

انفسی ورثہ "اخلاقی فضائل کا تہذیبی لاشعور ہے جو انسان کی بالقوہ فطرت پر مشتمل ہے جسے انبیاء کی تعلیم کے زیر اثر دنیا کے ہر خطے میں تاریخ کے ہر دور میں کسی نہ کسی درجہ میں نشوونما حاصل ہوئی ہے۔

فطرت انسانی کے دو پہلو

انسانی فطرت اپنے بالفعل اور بالقوہ دونوں پہلوؤں میں عمل ہے، پیدائش ہے، تخلیق ہے اور ترقی ہے۔ بحیثیت عمل کے اس مقصد کے حوالے سے پرکھا جا سکتا ہے جس کی سمت یہ بڑھ رہی ہے اور عروج و زوال اور فنا کی مصداق ہے بحیثیت پیدائش کے اس پر نتائج کے حوالے سے حکم لگایا جا سکتا ہے جو یہ پیدا کرتی ہے۔ بحیثیت تخلیق کے اس کا جائزہ پیدائش میں حدت و ندرت کے خصائص کی بناء پر لیا جا سکتا ہے۔ اور بحیثیت ترقی کے اس کی پیمائش اس پیمانے سے ہو سکتی ہے کہ یہ کس حد تک بتدریج اپنے مقصد سے قریب تر ہوتی جاتی ہے۔

بالفعل پہلو کے اعتبار سے فطرت انسانی جبلی داعیات طبیعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کی تکمیل کے عمل پر مشتمل ہے اور بالفعل فطرت کے تقاضے بالقوہ فطرت کے نشوونما پاکر ایک زندہ طاقت بننے کی جدوجہد میں مزاحم ہوتے ہیں۔ ان کا مزاحم ہونا نشوونما پانے کی ایک سازگار شرط ہے۔

زندگی کے تین پہلو ہیں انفرادی، اجتماعی جو معاشرت معیشت اور سیاست کو محیط ہے اور تیسرے بین الاقوامی زندگی میں ہمہ گیر انقلاب کے لیے اس کے ہر پہلو کی نسبت قرآن مجید سے یہ رہنمائی حاصل کرنا ہوگی کہ:

اصلاح طلب خاصیت کیا ہے؟

اصلاح پذیری کیسے متصور ہوگی؟

اصلاح کس نصب العین کے حوالے سے ہوگی؟

اس کے حاصل ہونے کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟

اس لائحہ عمل کی عملی اساس کیا ہوگی؟

اس کا معیار کیا ہوگا؟

اس کا نمونۂ کمال کیا ہوگا؟

اور وہ محرک کیا ہوگا جو استقامت دلا دے؟

اور جدوجہد سے انحراف نہ کرنے دے؟

ہر جدوجہد سے پہلے ایک یقین درکار ہے جس کے بغیر جدوجہد نہیں کی جا سکتی۔ اس یقین کی اساس یہ ہے کہ غایت تخلیق کائنات، غایت بعثت اور غایت نزول قرآن ایک ہی ہے اور کائناتی قانون نشوونما، تاریخی قانون تضاد اور سعادت و شقاوت کا ایسا قانون جو ناقابل تغیر اور ناقابل شکست ہوں جنہیں کوئی شیطانی طاقت

اور کوئی مفاد پرست جماعت شکست نہ دے سکتی ہو جو باہمگر مربوط ہوں نتیجہ خیزی کے ضامن ہیں۔ جن کی خاصیت قرآن مجید ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

لن تجد لسنة الله تبديلا

جن کی تشکیل یوں کرتا ہے۔

جعلنا لكل نبي عدوا من المجرمين (کہ ہم (اللہ) نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے ایک دشمن پیدا کیا) دشمن پیغمبرانہ دعوت کی مزاحمت کرتا ہے اور مزاحمت کرتا ہے اور مزاحمت سے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

اس کا وظیفہ اُمت کو مقصد سے قریب تر کرتے جانا ہے۔ تاریخی قانون یہ ہے کہ دو گروہوں حزب اللہ اور حزب الشیطان ان کے دو مقاصد ہوں پیغمبرانہ بعثت کے مقصد کا حصول اور مفاد پرستی کی بناء پر پیغمبرانہ دعوت کی مزاحمت کے پیچھے دو وفاداریاں ہوں ایک اسلام کی دوسری کفر کی، ان کے پیچھے دو منظم ارادے ہوں ایک حزب اللہ کا دوسرا حزب الشیطان کا۔ ان ارادوں کے درمیان تصادم ہو۔ اس تصادم میں کامیابی کے لیے دو پروگرام ہوں۔ ایک نفع بخشی فیض رسانی اور نشوونما دینے کا دوسرا مفاد پرستی کی بناء پر نشوونما روکنے کا۔ اس تصادم کا نتیجہ کائناتی قانون سعادت وشقاوت سے متعین ہوتا ہے۔ جن کی ترجمانی قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے۔

قد افلح من زكٰها وقد خاب من دسّٰها

یقیناً وہ فلاح پاگیا جس نے اپنے نفس کو حرص ولالچ سے پاک رکھا اور یقیناً وہ تباہ ہوگیا جس نے اپنے نفس کو حرص ولالچ میں مبتلا رکھا۔

اگر ہم نے قرآن مجید کو صحف ماسبق کی تمثیل پر قیاس کر کے اسے صرف قانون کا ماخذ قرار نہ دیا ہوتا اور تکمیل دین کے قرآنی تصور کو مسخ کر کے اسے تکمیل فقہ تصور نہ کیا ہوتا اور اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہوتی کہ:

اگر کوئی ایسا گروہ موجود ہو جو بعثت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نزول قرآن کی غایت کو حاصل کرنا چاہے تو اس کی غایت کیا ہو؟ اس کا تصور کائنات کیا ہو جو حصول غایت سے سازگار ہو؟ اس کا زاویۂ نگاہ کیا ہو، معیار کیا ہو لائحہ عمل کیا ہو اور اس کی دعوت کیا ہو؟" جو۔

کلی (عالمگیر) ہو کہ محدود وفاداریوں پر منظم ہونے والے گروہوں کے عناد سے محفوظ رہے۔

مثبت ہو کہ منفی تصور سے پیدا ہونے والی یاس وناامیدی کا شکار نہ ہو اور زندگی کو سہارا دے سکے۔

عملی ہو تاکہ عملی حیثیت سے بے نتیجہ نہ ہو اور خاطر خواہ نتائج پیدا کر سکے۔

قابل عمل ہو تاکہ اس کے لیے جدوجہد کرنے کی ترغیب ہو۔ ولولہ انگیز ہو تاکہ اُسے واقعہ بنانے کے لیے جدوجہد میں جتنی شدت ہونی چاہیئے وہ بطور خود پیدا ہو سکے۔

حتماً قطعاً اور یقیناً نتیجہ خیز ہو تاکہ اس کی حقانیت منطقی دلیل سے بے نیاز رہ سکے۔

یہ مسئلہ بغیر تعبیر کے بغیر تفسیر کے بغیر تاویل کے صرف نصوص قرآنی سے سنۃ کے نمونے پر حل کیا جائے تو مذہبی علم کی علمی صورت گری کا وہ مطالبہ پورا ہو سکے گا جو خود علامہ اقبال کے نقطۂ نگاہ سے قرآن مجید سے حل ہونا چاہیئے مگر جب تک قانون ساز مذہبی ذہن کی پیروی میں ہم یہ سمجھتے رہیں گے کہ قرآنی وحی نے انسانی استعداد کے زائیدہ علم کی حاجت مندی سے بے نیاز نہیں کیا تب تک قرآنی اور انسانی علم کی آہنگی ہی مذہبی علم کی علمی صورت متصور ہوتی رہے گی۔

ضرورت یہ ہے کہ ہم انسانی استعداد کے زائیدہ علم کی حاجت مندی سے نکل کر قرآنی وحی کے علم کے مسئلے کا حل قرآن مجید سے حاصل کریں۔ کیونکہ یہی طرز عمل علامہ اقبال کے اس مؤقف سے ہم آہنگ ہے کہ Quran is a book which emphasises deed rather than idea اور اگر ہم اس مؤقف کو صحیح سمجھیں تو قرآن ہی سے وہ نصب العین اور اسے حاصل کرنے کا لائحۂ عمل میسر آسکے گا جو قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی کا ضامن ہو وہی Scientific form of Religious Knowledge ہو گی اور اسی کی بنیاد پر ہم مذہب کے اس مسخ شدہ تصور سے نجات حاصل کر سکیں گے۔ کہ :

"بے جان عقائد مردہ رسوم، فرقہ پرستانہ آرزوئیں اور مفاد پرستانہ گروہ بندیاں ہی پیغمبرانہ راہ حق پرستی ہیں اور متحد ہونا کفر ہے اور دینی حمیت کا اظہار فرقہ پرستانہ منافرت میں ضروری ہے۔"